رنگوں میں اُتر آنا

شفیق آصف

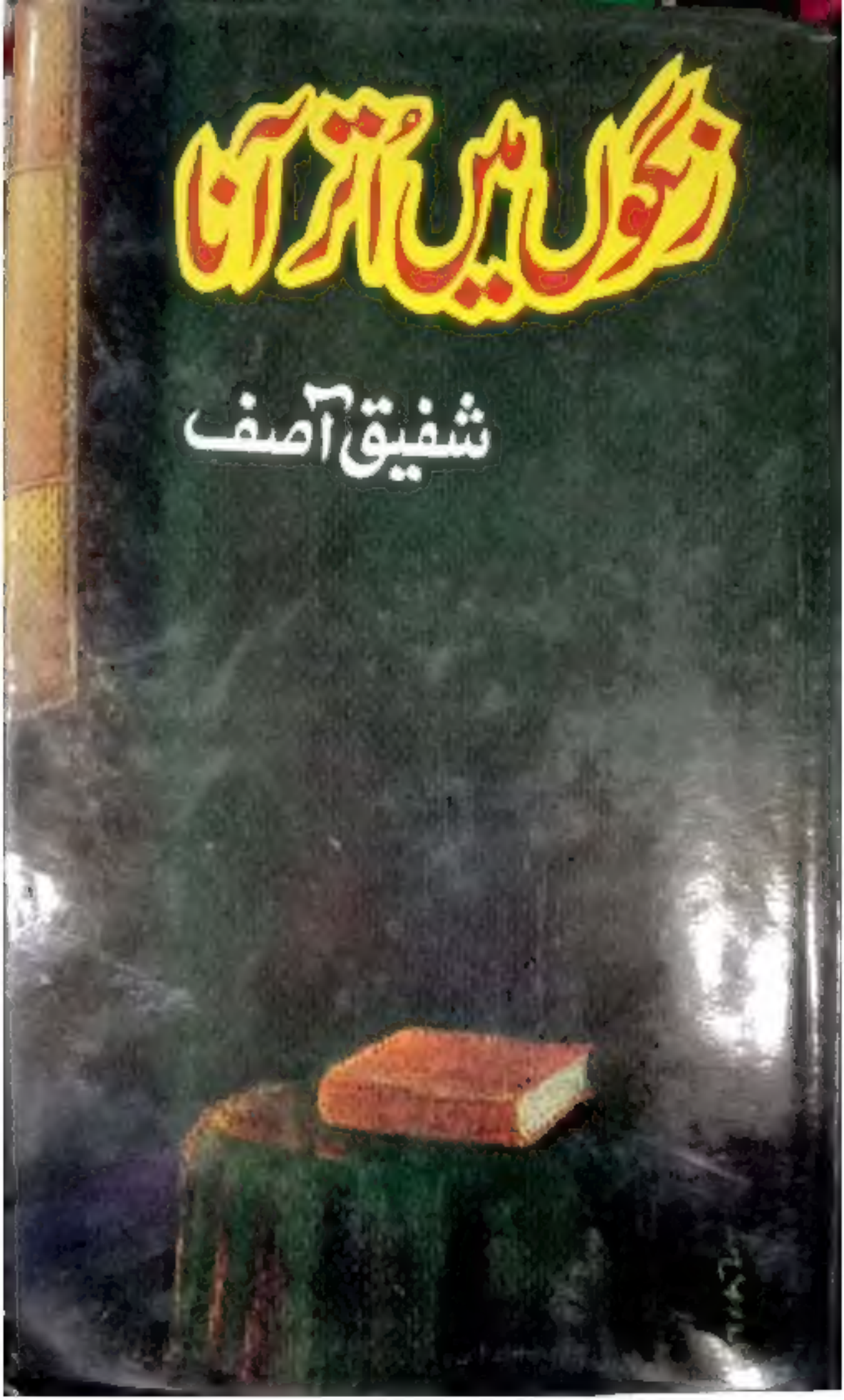

Scanned with CamScanner

شفیق آصف کی شاعری میں اظہاریت کا رنگ و آہنگ، کیف و کرب کا امتزاج اور لہجے کی بے ساختگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ اُس کی تخلیقی اُپج نے حسن آگہی اور جستجوئے جمال سے جنم لیا ہے۔

رواں صدی کی گذشتہ چند دہائیوں میں انقلاب سامان ارتقا کی رفتار اتنی تیز رہی ہے اور مسابقت کے رجحان میں کچھ اس انداز سے اضافہ ہوا ہے کہ قرار نا آشنا زندگی تنازعۂ بقا کی شدتوں میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہے۔

دھرتی سے اُٹھ کر پرواز کا شوق اور کہکشاؤں پر کمندیں ڈالنے کی ہوس نے آج کے انسان کو جن خلاؤں سے رُوشناس کرا دیا ہے۔ اُن میں نہ تو جہات کا کوئی تصور ہے اور نہ ہی قدم جمانے کی کوئی طلب۔ ایسے زمانے میں خود رفتہ ہم عصروں کی بھیڑ میں تنہائی کا کرب شفیق آصف کے لئے اجتماعی کرب سے ہم رشتہ و پیوستہ نظر آتا ہے۔ لیکن وہ حالات کی ناسازگاریوں اور سنگینیوں سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شفیق آصف کی شاعری میں بشارتوں کی کہکشاں بچھی ہوئی نظر آتی ہے۔

سید فخر الدین بلے

شفیق آصف اسّی کی دہائی میں ادبی اُفق پر طلوع ہونے والے نوجوان اُردو شعراء میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا اعتدال اور دھیمے پن اُن کی شاعری میں بھی در آیا ہے۔

شفیق آصف کی غزل اپنے تمام تر کلاسیکی پیرہن کے باوصف فکری اور معنوی اعتبار سے تازگی اور تنوع کا احساس دلاتی ہے۔ اِس ضمن میں اُن کے بیشتر

اشعار حوالے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

محمد افسر ساجد

۸۰ء کی دہائی سے غزل کی شاعری نے جو جدید رخ اختیار کیا اُس میں غزل کہنے والے نوجوان شاعروں کی ایک بڑی کھیپ لہجے اور اسٹائل کے اعتبار سے ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال، افتخار عارف، ثروت حسین اور اظہار الحق کے صوتی اور بصری رنگوں کا شکار رہی۔ شفیق آصف نے اس صورت حال میں اپنی جداگانہ شناخت پیدا کرنے کی انفرادی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک شفیق آصف کی غزل مٹی، دھنک اور محبت کی تکون سے عکس ریز ہوتی ہوئی پیکر میں آئی ہے۔ اور اپنے گرد پھیلے جہانوں میں اثر پذیر ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

شفیق آصف نے آوازوں کی بھیڑ میں اپنی آواز کو کسی بھی لہجے کی گونج اور بازگشت سے محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ کامیابی کسی بھی نوجوان غزل گو کے لیے بہت ضروری ہے۔ شفیق آصف نے محبت کے عمل میں اپنے پورے وجود کو شامل رکھا ہے۔ وہ بیمار رومانیت کے اسیر شاعروں کی طرح محبت میں آدھے دھڑ تک محدود نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں محبت کسی فرد واحد یا ذات تک محدود رہنے کی بجائے کائنات میں مٹی سے شفق تک پھیل گئی ہے۔ اظہار کے یہ حوالے شفیق آصف کی آواز اور رنگوں کو عہدِ موجود کے نوجوان اُردو شاعروں میں منفرد اور ممتاز کرتے ہیں۔

ممتاز اطہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رنگوں میں اُتر آنا

Scanned with CamScanner

ہم نے منظر کی کشش کو اپنی آنکھیں سونپ دیں
صُورتوں کی بھیڑ میں جب آئینے کم ہو گئے

Scanned with CamScanner

رنگوں میں اُتر آنا

شفیق آصف

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انارکلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

Scanned with CamScanner

ہماری کتابیں .....

خوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

الحمد

ضابطہ

بارِ اوّل ——— مارچ ۱۹۹۷ء

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس لا

سرورق ——— امتیاز مرزا

کتابت ——— رحمت علی انصاری

انتخاب ——— احمد رضوان

ترتیب ——— نوید شہزاد

قیمت ——— ۱۰۰ روپے

انتساب

ممتاز العیشی

اور

آنس معین

کے نام

Scanned with CamScanner

شفیق آصف میرے ہر موسموں کا ساتھی ہے مجھے اُس کی شاعری اور شخصیت میں سوچ کی صداقتیں اور جذبوں کی اطاعتیں معصومیت کے چراغ لے کر صف بہ صف ایستادہ دکھائی دیتی ہیں شفیق آصف ایک ایسا منفرد اور جدید غزل گو شاعر ہے جس کا فن حرف حرف کو گویائی، لفظ لفظ کو زیبائی اور جذبوں کو پیکر عطا کرنے میں یکتا ہے چمکتے سورج، دمکتے ستاروں اور نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اُس کا طائرِ خیال اِس طرح محوِ پرواز رہتا ہے جیسے کوئی پرندہ کائنات کی تنظیم نو کے لیے مصروفِ عمل ہو۔ سبزہ و گل کی مہکاریں، مہ وشوں کی شوخیاں اور دلوں کی دھڑکنیں شاعری کے سفر میں اُس کی ہمرکاب ہوتی ہیں۔ شفیق آصف صریرِ خامہ سے صورت و آہنگ کو تخلیق کرتا ہے وہ نرلیت کے لامحدود امکانات کی تلاش میں رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں انسانی زندگی کا معروضی اور باطنی عکس نمایاں نظر آتا ہے۔

اختر جعفری

فہرست

عصرِ رواں کی غزل —— پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی ۱

چاند، میں اور شفیق آصف —— اقبال ارشد ۱۸

شفیق آصف —— انسانی قدروں کی شکست کا نوحہ گر —— پروفیسر انور جمال ۲۰

نقشِ احمریں —— جمیل احمد عدیل ۲۶

حمد ۲۷

نعت ۲۹

سلام ۳۱

غزلیں

شبِ سیاہ میں خوابِ ہُنر کو زندہ رکھ ۳۳

حق بیانی کے لیے دُنیا میں تعزیریں عجب ۳۵

ہے میرے دِل کے آئینے میں اِک تصویر مٹی کی ۳۷

وہ بلا تو جانے کیوں اِک شور سا برپا ہُوا ۳۹

محبت کی کرشمہ سازیاں آواز دیتی ہیں ۴۱

غموں سے دِل بہلنے میں ابھی کُچھ دیر باقی ہے ۴۳

حریمِ شام کا منظر چمکتا ہے نگاہوں میں ۴۵

سر پہ سلگتی دُھوپ تھی اور سائباں نہ تھا ۴۷

خود ہی رو کر گیت سُنانے لگتے ہیں ۴۹

[illegible] گیا

[illegible]

[illegible] تھا

دل [illegible] ہو تو

[illegible] ۰۹

[illegible] ہیں

[illegible] ہیں

[illegible] ۰

وقت کی بے نام کرری ساعتوں میں قید ہوں

خون اپنا پلانا ہے، اور خوب پلانا ہے

رنگ دل پر جو تری یاد کے آہو آئے ۰۹

اس کے لہجے سا کہیں بھی بانکپن ملتا نہیں ۰

تھا جو پیکر عالم تمثیل میں ۰۷

محبتوں کا مری جاں کوئی حساب نہیں ۰۵

بحر غم کا کٹاؤ کیسا ہے ۰۰

زندگی کی رہگزر ہو اور تو ہو ۰۹

ضبط کی گہرائی سے حرف بیں تک آ گئے ۰

بینائی کھو رہی ہے لمحوں کی تیرگی سے ۰۳

گر محبت عطا کرے کوئی ۰۰

دل کی دنیا کا پاسباں کہہ دوں؟ ۰۰

[illegible] ۰۹

جب سورج نے اوڑھا بادل ۰

[illegible] ۱
[illegible] ۹
داستانوں میں رزمیوں میں ہیں
زندگی کے خلا سے گزرے ۱۱
[illegible] تھا
ضرور نظر آئیں تو چہرے بہت ہیں
آنکھ میں کیسا سپنا جاگا ۱۵
تیرے لوٹ آنے کی یہ بھی اک نشانی ہے
[illegible] ایک شاخِ چمن زار پہ نکھار آیا
جب ہم تعلق و وقف جذبات ہو گئے
جو شہر دوزخیوں کو کبھی دیکھا نہیں کرتے
ملن رُت کو دل سے نکالا نہیں ہے ۱۳
[illegible] تجھ سے یہاں شہر میں قتل نہ ہوا
[illegible] فصیلِ تیرگی میں در اٹھانا چاہیے
تجھے ہے وقت کے طوفان کو تنہا مجھے
[illegible] کا ہو حساب غمِ روزگار سے
پیاسوں کی زندگی میں بلا کے عذاب تھے ۲۳
ہماری پیاس کو دہکا گیا ہے ۲۵
ہر سُو تنہائی کے تارے روتے تھے ۲۷
آئنہ جس نے توڑ ڈالا تھا ۲۹
کچھ ایسا زندگی کا ستارہ مجھے ملا
وہ اندھیرے ہیں یا اُجالے ہیں ۳۳

[illegible] اس ہوا سے بھی اڑ جانی کر
یہ ٹوٹی پھوٹی جو کشتیاں ہیں
[illegible] تمنا کا امکاں نہیں رہا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اب وہ پہلی سی کہانی بھی نہیں
[illegible] جب سے رہتے گم ہوئے
[illegible]
دل جو صرف نظر نہیں ہوتا
درد لمحوں میں بھر گیا کوئی
ظلمت جب تنویر رہے گی
ظلمتوں سے رہائی ہو جائے
جو دل کو کسی طور کشادہ نہیں کرتے
[illegible]
اُس کا ہے انتظار پھر شاید
[illegible] لہروں سے ہمکنار اب تک
ذہنوں پہ مسلط ہے جو اُن کا شش چلا جائے
شبنم بدوش شعلہ بیانی کے سلسلے
[illegible] ٹوٹیں گے جب چہرے فنا ہو جائیں گے
[illegible] جہاں چل رہا ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آدمی اپنی تباہی کی طرف ہے گامزن
ہم چلے تھے کس طرف اور کہاں تک آ گئے؟

اس طرح اپنی ذات میں تنہا ہے آدمی
بکھری ہو جیسے کرچ کوئی آئینہ دار سے

سوال یہ ہے کہ کرچ آئینہ دار سے کس طرح بکھر گئی؟ آدمی، انسانیت کی راہ پر چلتا چلتا آخر کیوں بھٹک گیا؟ اور انسانیت، شاہراہِ حیات پر ٹوٹے کھلونے کی طرح کیوں بکھر گئی؟ شاعر کے نزدیک اس حادثے کا سب سے بڑا سبب سماجی اقدار کا مسخ ہو جانا ہے۔ عصرِ رواں میں آفاقی قدر کے مفاہیم کا بدل جانا ہے۔ جب ماحول پر حبس کی حکمرانی ہو اور انسان رزق ہو جائے، جب بندوں سے آزادی چھین کر انہیں محبوس کر دیا جائے، جب فضاؤں میں تعصب اور افتراق کا زہر بھر دیا جائے، جب زندگی کے چہرے سے شادابی اور حسن نوچ کر اس پر آسیبی ماسک چڑھا دیا جائے تو آدمیت کا اعتبار اور انسانیت کا وقار ضرور مجروح ہوتا ہے۔

آج سورج ہے قید میں شاید
آج بادل سروں پہ کالے ہیں
کج روی، افتراق و محرومی
سب اسی عہد کے حوالے ہیں

یہاں شگفتہ ہواؤں کا کون طالب ہے؟
یہاں تو حبس کا موسم ہے سازگار اب تک

[illegible] ہو رہے ہیں [illegible] جانے کن [illegible]
خود اپنے پاؤں میں ڈالے ہوئے [illegible]

جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دور تک اک سلسلہ ہے جس کا پھیلا ہو

فضا پر حکمرانی ہے ابھی تک حبس کی [illegible]
یقیناً رُت بدلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

جب شاعر رُت بدلنے کی بات کرتا ہے تو اس کی شاعری میں [illegible] پیدا ہوتا ہے۔ یہیں یاس کی آندھیوں کے رستے پر آس کا [illegible] محرومیوں کے تاریک جنگل میں جگنو کی روشنی اپنے وجود کا احساس [illegible] شبِ تاریک میں گم کردہ راہ مسافر قندیلِ رہبانی کا [illegible] کو منزلوں کا نقیب کہتا ہے۔ اب اسے زمین پر بھی آدمیت کے [illegible] لگتی ہیں۔ شاعر کے رجائی لہجے کو پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے جب وہ کہتا ہے

خزاں کے خوف سے [illegible] پرندو لوٹ بھی آؤ
تمہیں پھر لہلہاتی ٹہنیاں آواز دیتی ہیں

شاعر ایسے موسم کی نوید دیتا ہے جس میں غنچے وا ہوتے ہیں، [illegible] کی تکمیل ہوتی ہے۔ فضاؤں میں رنگ و نکہت کا چلن عام ہوتا ہے لیکن شاعر سمجھتا ہے کہ ایسے موسم کی تخلیق کسی اعجاز یا اتفاق کا ثمر نہیں ہوگی۔ اسے [illegible] کو اپنے تئیں کاوش کرنی ہوگی۔ شاعر کو یقین ہے کہ اچھے [illegible] کے لیے [illegible] کے لیے شاعر ایک جامع نصاب تجویز کرتا ہے

عہد و اخلاص کے وسیلے سے
سارے ذہنوں پہ تو خدائی کر

پہلے اپنے خون میں بھیگی ہوئی لفظ نکال
پھر محبت کے حوالوں میں کوئی وسعت نکال
تیرگی کے زہر میں جل جائے نہ تیرا وجود
جس طرح ممکن ہو، شہر ذات سے ظلمت نکال

شب سیاہ میں خواب ہنر کو زندہ رکھ
صلیب وقت پہ نقش سحر کو زندہ رکھ
ہر ایک چیز تو پتھر نہیں ہوا کرتی
ترا سنی آنکھ میں ذوق نظر کو زندہ رکھ
کہ نہیں کوئی سورج تو دل کے آنگن میں
دیئے کی لو میں لہو کے سفر کو زندہ رکھ

مجھے یقین ہے کہ شفیق صاحب کی یہ شب سیاہ میں خواب ہنر کو زندہ رکھنے کی جدوجہد عصر رواں پر اگر جون ہوئے سفر کو زندہ رکھا تو ایک دن اس کے من آنگن میں سورج ضرور اترے گا۔ ایسا سورج جس کی تابانی اس کی ذات کو زیادہ منور اور اس کی غزل کو زیادہ توانا اور معتبر بنا دے گی۔

شخصیت سازی میں بھی کچھ وقت لگتا ہے شفیق — مشورہ ملتا ہے لیکن وقت نہیں ملتا

پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی
جنوری ۱۹۹۰ء

چاند، گیت اور شفیق آصف

شفیق آصف ایک نوجوان [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] میں تصور کرے یا کہیں شاعرے میں غزل [illegible]
[illegible] کے ساتھ جو [illegible]

شفیق آصف نے [illegible] کی [illegible]
سے زیادہ [illegible] ہیں [illegible]
زمین و آسمان کی وسعتیں [illegible]
جرائد و [illegible] کے صفحات میں [illegible]
ہیں [illegible]

شفیق آصف کی شاعری [illegible]
کی [illegible] میں [illegible] کے جو [illegible]
محبت [illegible] کے ساتھ [illegible] شفیق آصف

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرنے والے بزرگ شاعر بھی تھے [illegible]

[illegible]

[illegible] تک کالم نگاری بھی کی ـــ مگر اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

تشفیق صاحب نے [illegible]

[illegible] اُسے اس بات سے [illegible] جس کی [illegible] سے [illegible]

تشفیق صاحب کا شاعر ہونا اس سے [illegible] سے منسلک نہیں [illegible] وہ چاہتا [illegible]

کرتا، کسی سیاسی پارٹی سے متعلق ہو کر [illegible] وہ قرضہ معاف کرا لیتا ـــ شاعر ہونے میں یہ قباحت ہے [illegible] دنیا دار نہیں رہتا

اور اگر دنیا دار بنے تو شاعر نہیں رہتا ـــ

کہا جاتا ہے کہ وہ شاعر اور ادیب جو اپنی تخلیقات میں [illegible] بار بار کرتے

ہیں ماضی پرست ہوتے ہیں جیسے فنکار اپنی [illegible] میں [illegible] رہتے ہیں

شفیق آصف نے بھی چاند سے مکالمہ کیا ہے [illegible] بھی چاند کا ذکر کرتا ہے محنت سے کرتا ہے۔ انتظار حسین [illegible] اعتبار ساجد اور میری طرح شفیق آصف بھی ماضی پرست ہے ماضی پرست [illegible] ہے جس کا کوئی ماضی ہو ——— ماضی بھی سب کو میسر نہیں آتا خوبصورت دن [illegible] ہیں اور یادیں چھوڑ جاتے ہیں شفیق آصف نے اپنے ماضی کو [illegible] بھی رویا ہے اور ہمیں بھی رلایا ہے

نئی نسل جس انداز سے زیست کر رہی ہے وہ اس کا حق بھی ہے [illegible] ہیں یقیناً یہ استحقاق نہیں [illegible] نئی نسل کے کسی فرد کو فنون لطیفہ میں [illegible] روکوں ——— موسیقی شاعری، مصوری اور سنگ تراشی کے ضمن میں روایت و جدت بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

میں بیس سالہ شاعر کے روبرو روایت پرست ہوں مگر آج سے بیس سال پہلے بزرگوں کے سامنے جدید، جدید تر اور جدید ترین بھی تھا۔ میں شاعر کو نسل کے حوالے سے پہچانتا ہوں اور نسل کی کیفیت کو شاعری کی روداد میں دیکھتا ہوں مجھے ظاہر ہے کوئی شخص بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ میں شفیق آصف جیسے خوبصورت شاعر کو جدید ترین شاعر کہوں وہ بہت اچھے شعر کہتا ہے وہ ایک اچھا انسان بھی ہے [illegible] رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہے ایسے افراد نہیں ملتے اور اگر مل جاتے ہیں تو انہیں بخوشی شفیق آصف کہا جا سکتا ہے۔

اقبال ارشد

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء

شفیق آصف — انسانی قدروں کی شکست کا نوحہ گر

(۱)

جب معاشرہ سماجی رویوں میں [illegible] جہاں [illegible]
[illegible] توجہ [illegible] ان کی [illegible]
[illegible] زندہ رہنے کے لیے [illegible] دیا جائے اور [illegible] جانب [illegible]
معدوم حتیٰ کہ قانون نافذ کرنے والے [illegible] بے [illegible]
[illegible] جہاں [illegible] کی [illegible] قدری سے
بھی زیادہ ہو [illegible] وہاں [illegible] ہوگا!

مزاحمت تو سیاسی اشخاص اور صاحب اقتدار قوتوں کے خلاف ہو
کرتی ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ وحشت نے مذہبی جنونیوں کے جنون میں [illegible]
دی ہوں وہاں احساس دم بخود رہ جاتا ہے

جہاں جنت کے دل آویز باغوں میں خوش [illegible] حوروں کی صحبت کی نوید ——— اور
[illegible] غلمان کی شان دلبرانی کی بشارت کلمہ گو ہو وطن کو جاؤ [illegible] طرح [illegible]
چوری [illegible]۔ مذہب خود غرضی خیانت منافقت [illegible] تعاشی [illegible]
سیاسی اشخاص جیسے جرم بہت چھوٹے نظر آتے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہیں اٹھتا)

[illegible] دوسرا رد عمل [illegible] ہیں [illegible] علم کا دعویٰ [illegible] ہیں جاتی [illegible] وہ (مبہوت) ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے — وہ کچھ بولنا چاہتا ہے [illegible] بول سکتا

(۲)

ہمارے عہد کا [illegible] کا خاص طور پر نوجوان شاعر [illegible] ایسی شاعری [illegible] شاعری کہنا بھی محل نظر ہے، کرتا چلا جاتا ہے [illegible] جس کی بنیاد [illegible] وہ تخیل کی ندرت فکر کی گیرائی، جذبے کی [illegible] تجربے کی [illegible] بالیدگی سے ناواقف ہوتا ہے بس بے جنونی نصیب ہوتی ہے [illegible] پڑے ہیں، ہر نیا شعری مجموعہ چھپ جانے والے خود فریب شاعروں کا ایک جمگھٹا موجود ہے [illegible] ٹاٹوں پر خوش نما تمثیلوں کے ساتھ ضخیم مجموعے پڑے ہوئے ہیں [illegible] ساقط اوزان مستلزم مضحکہ خیز [illegible] جنہیں دیکھ کر ایک سلیم الطبع شخص سر پکڑ لیتا ہے کہ اگر یہی شاعری ہے تو دیواروں پر لکھے اشتہاروں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوئے شعروں میں کیا قباحت ہے

(۳)

شفیق آصف بھی اسی عہد پُر آشوب میں زندہ ہے لیکن اس نے شاعری کو "کاریگری" کے طور پر نہیں اپنایا [illegible] نہ اسے دیوانگی بننے دیا ہے۔ ایک

[illegible]

[illegible]

تمہاری نفرتوں کے دور سے گزر کر
محبت کا قرینہ آ گیا ہے

وفا کی تاریخ لکھ رہا ہوں
لہو لہو میری انگلیاں ہیں

[illegible]

(۴)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سب اسی جہد کے ہوئے ہیں

آدمی اپنی تباہی کی طرف سے کاہاں
ہم چلے تھے جس طرف بس یہاں تک آ گئے

سے دانش، ہم تب سے اندازہ کرتے ہم
طوفان تند و تیز کی زیر آب تھے

جانے کب وہ کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دور تک کی سلسلہ ہے جس کا پھیلا ہوا

جانے کیوں اس دور کا ہر آدمی
محو ہے انسان کی تذلیل میں

(۵)

[illegible] سے بہت فرق [illegible] ہیں، [illegible] اس وقت اس کا عہد منافقت کے

[illegible]

(۶)

[illegible]

خود ہی رو کر گیت سنانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو [illegible]
خود ہی خود کو کرتے ہیں [illegible]
خود ہی [illegible]
خود ہی [illegible]
خود ہی [illegible]

پروفیسر انور جمال

نقشِ آخریں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حمد

کچھ ایسے شاعری کو مری خدّوخال دے
شہرِ سخن میں جس کی زمانہ مثال دے

تاریکیوں کا جنس ہے میرے وجود میں
جذبوں کی روشنی سے مرا دل اُجال دے

روشن رہیں چراغ محبّت کے عُمر بھر
کچھ ایسا ذوقِ دید کو عکسِ جمال دے

یکتا ہے تو، نہیں ہے کوئی تجھ سا دوسرا
کس کو مجال ہے کہ وہ تیری مثال دے

کاسہ بدست پھرتے ہیں راہِ طلب میں ہم
ممکن نہیں جو سب تو اذنِ سوال دے

ڈرتا ہوں شہرِ ذات کے ہولوں سے شفیق
مجھ کو حصارِ خوف سے مولا نکال دے

نعت

نہ خواہش ہے ثوابوں کی نہ منشا مال و زر کا ہے
گدا ہوں تیری گلیوں کا مقدر تاجور کا ہے

مری آنکھوں میں اب تک کوئی بھی منظر نہیں ٹھہرا
جو منظر ہے مرے پیشِ نظر، طیبہ نگر کا ہے

جو حُسنِ مصطفائی ہے، وہ عکسِ کبریائی ہے
ذرا سا فرق ہے، جو حُرمتِ فکر و نظر کا ہے

فرشتے ہر قدم صلّی علےٰ کا ورد کرتے ہیں
نہ کچھ دور ہی آقا مدینے کے سفر کا ہے

مدینے کے گلی کوچوں میں پھرتا ہوں ہر اک لمحہ
کہاں اندازہ مجھ کو حلقۂ شام و سحر کا ہے

پروں کو باندھ کے جبریلؑ رہتا ہے جہاں آصف
جبیں کو شوق سجدہ بس اسی اک سنگِ در کا ہے

سلام

[illegible] نے پہلو میں دشت کربلا [illegible]
جس کی [illegible] مری [illegible] [illegible]

تا ابد روشن رہے گا وقت کے [illegible] پر
حق کی خاطر خون سے جو نقش [illegible] [illegible]

آج تک تابندہ و خشندہ ہے نام حسینؑ
روشنی کا راستہ بھی کیا کبھی روکا گیا؟

مل گیا ہے جس کو عرفان حسینؑ ابن علیؑ
وہ بشر صبر و قناعت کی حقیقت پا گیا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

*

شبِ سیاہ میں خوابِ ہُنر کو زندہ رکھ
صلیبِ وقت پہ نقشِ سحر کو زندہ رکھ

ہر ایک چیز تو پتھّر نہیں ہُوا کرتی
تُو اپنی آنکھ میں ذوقِ نظر کو زندہ رکھ

اگر نہیں کوئی سُورج، تو دِل کے آنگن میں
دیئے کی لَو میں لہُو کے سفر کو زندہ رکھ

ابھی سجانے ہیں گذشتہ زندگی سے نقوش
رہِ حیات میں دستِ ہنر کو زندہ رکھ

مسافرانِ خرد لوٹ کر بھی آئیں گے
حصارِ ذات کے دیوار و در کو زندہ رکھ

شفیقؔ حسنِ طلب ایک چیز ہے لیکن
طلب میں حرفِ دعا کے اثر کو زندہ رکھ

---

*

حق بیانی کے لیے دنیا میں تعزیریں عجب
زہر کے ساغر عجب مقتل کی زنجیریں عجب

دن چڑھا تو دفعتاً بینائیاں بھی چھن گئیں
خوابِ راحت کی ملی ہیں ہم کو تعبیریں عجب

کیوں نہ ہم یہ آرزو کے خواب بننا چھوڑ دیں
ہیں فقیروں کو میسّر غم کی جاگیریں عجب

خواہشِ بے رنگ ہے موہوم سا پیکر لئے
سج رہی ہیں دل کے آئینے میں تصویریں عجب

پھر بھی چھٹکارا نہ مل پایا تمہاری یاد سے
بچ نکلنے کے لیے کیں یوں تو تدبیریں عجب

ہم بھی اُن بھٹکے ہوئے لوگوں میں شامل ہیں شفیق
راہِ اُلفت میں ہوئی ہیں جن سے تقصیریں عجب

---

*

ہے میرے دل کے آئینے میں اِک تصویر مٹی کی
مرے مٹی کے خوابوں کو مِلی تعبیر مٹی کی

بھٹکتے پھر رہے ہیں ہم نہ جانے کن جزیروں میں
خود اپنے پاؤں میں ڈالے ہُوئے زنجیر مٹی کی

تکلّف برطرف آنکھوں میں میری اِک ذرا جھانکو
وہاں تُم کو نظر آئے گی اِک تصویر مٹی کی

[illegible]

[illegible]

مجھے اپنوں سے رہتا ہے [illegible]
مرے سب تیرے مٹی کے [illegible]

محبت خاک کے پتلوں کے دل بھی جوڑ دیتی ہے
شفیق اپنی متاعِ زیست ہے جاگیر مٹی کی

*

وہ ملا تو جانے کیوں اک شور سا برپا ہُوا
بات معمولی تھی سارے شہر میں چرچا ہُوا

چل رہی تھیں سارے جنگل میں ہوا کی برچھیاں
پاس ہی اِک جھونپڑی میں دیپ تھا جلتا ہُوا

رات روتے تھے ستارے بیکسی پر جب مری
چاند کو دیکھا تھا میں نے جھیل میں ہنستا ہُوا

ساتھ کب دیتی ہیں شامِ دشت میں پرچھائیاں
ایسے عالم میں جُدا وہ ہو گیا اچھا ہُوا

لوگ [illegible] آ [illegible]
[illegible] انسان [illegible] پھول [illegible] ہوا

[illegible] اور اس [illegible] آزادی سے
دور تک [illegible] جس کا پھیلا ہو

اک کھلونے کی طرح انسانیت کا ہے وجود
شاہراہِ زندگی پر ٹوٹ کر بکھرا ہوا

میری آنکھیں رات دن بس اس کی جانب ہیں شفیق
ان خلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہوا

*

محبّت کی کرشمہ سازیاں آواز دیتی ہیں
تری یادوں کی الہڑ شوخیاں آواز دیتی ہیں

مُسافر لَوٹنا چاہو تو لمحوں میں پلٹ جاؤ!
تمھیں ساحل پہ ٹھہری کشتیاں آواز دیتی ہیں

ذرا سی دیر میں موسم بدلنے کا زمانہ ہے
ہَوا کے بازوؤں کی چُوڑیاں آواز دیتی ہیں

خزاں کے خوف سے سہمے پرندو! لَوٹ بھی آؤ
تمھیں پھر لہلہاتی ٹہنیاں آواز دیتی ہیں

چلے جاتے ہیں ہم اپنا لہو ایندھن بنانے کو
دُھوں دیتی ہُوئی جب چمنیاں آواز دیتی ہیں

مَیں جب بھی شب کے دامن پر کوئی سُورج اُگاتا ہُوں
تری سوچوں کی گہری بدلیاں آواز دیتی ہیں

ذرا سی دیر کو کُچھ شادماں لمحے عطا کر دو
ذرا سُننا! غموں کی تلخیاں آواز دیتی ہیں

شفیق احباب اکثر یاد آتے ہیں ہمیں اب بھی
ہَوا کے ساتھ بجتی تالیاں آواز دیتی ہیں

---

*

غموں سے دل بہلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
مجھے گر کر سنبھلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

مَیں اپنی کھوج میں نکلا ہُوا ہُوں اک زمانے سے
مرا پیکر نکھرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

سفر موقوف کرنے کی ابھی خواہش نہیں جاگی
مرے دل کے ٹھہرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

کلی سے پھول بننے کا عمل جاری نہیں ہوگا
اگر سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

ابھی موسم کے ہاتھوں نے ہوا کے پَر نہیں کھولے
کہ بُوئے گُل بکھرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

جو ممکن ہو شفق سے شامِ غم کی داستاں سُن لیں
شبِ تیرہ اُترنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

فضا پر حکمرانی ہے ابھی تک حبس کی آصفؔ
یقیناً رُت بدلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

*

حریمِ شام کا منظر چمکتا ہے نگاہوں میں
یہ کس کی یاد کا دریا مچلتا ہے نگاہوں میں

گلابوں کے جزیرے میں اکیلے بیٹھ کر اکثر
تمھاری سوچ کا پیکر نکھرتا ہے نگاہوں میں

جسے ہم عُمر بھر دیکھا کیے اپنے خیالوں میں
وہی اِک نقش صدیوں کا بکھرتا ہے نگاہوں میں

مَیں جب بھی رتجگوں کی چاندنی میں رقص کرتا ہُوں
کسی کا عکس چپکے سے اُترتا ہے نگاہوں میں

وہ نازِ دل جہاں بھی ہو، قرارِ جاں ہی رہتا ہے
اُسی کا پھول سا چہرہ مہکتا ہے نگاہوں میں

سحر کے لوٹ آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
ستارہ آخرِ شب کا دمکتا ہے نگاہوں میں

ہمارا خواب شاید ہو رہا ہے مُنکشف آصفؔ
تمہارے خواب کا پَرتو اُبھرتا ہے نگاہوں میں

---

*

سر پہ سُلگتی دُھوپ تھی اور سائباں نہ تھا
دشتِ سفر میں ہم سا کوئی بے اماں نہ تھا

پھرتے رہے ہیں خانہ بدوشی میں عمر بھر
اپنوں کے شہر میں کوئی اپنا مکاں نہ تھا

یہ سانحہ بھی کم تو نہیں راہِ زیست میں
منزل قریب تر تھی مگر کارواں نہ تھا

تصویرِ ذات اپنی کوئی دیرپا نہ تھی
نقشِ کفِ خیال بھی کچھ جاوداں نہ تھا

دِل میں اگرچہ درد کا طوفاں تھا موجزن
چہرے سے پھر بھی کرب کا منظر عیاں نہ تھا

بچھڑیں گے تُم سے اس کا تو خدشہ رہا مگر
ترکِ تعلّقات کا وہم و گُماں نہ تھا

آصفؔ شفق کی لَو پہ سُلگتے رہے وجُود
لیکن زمینِ غم کا کوئی آسماں نہ تھا

---

*

خود ہی رو کر گیت سنانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو ہم دیوانے لگتے ہیں

خود ہی خود کو کرتے ہیں ہم قتل یہاں
خود ہی اپنا سوگ منانے لگتے ہیں

خود ہی سُولی چڑھتے ہیں پچھتاوے کی
خود ہی اپنا من پرچانے لگتے ہیں

خود ہی چہرہ چہرہ چُنتے ہیں خود کو
خود ہی سارے نقش مٹانے لگتے ہیں

خود ہی پُھلجھڑیوں کے کھیل کو کھیلیں ہم
خود ہی خود کو آگ لگانے لگتے ہیں

خود ہی دیپ جلا کر اس میں
خود ہی درد کا شہر بسانے لگتے ہیں

خود ہی بٹ جاتے ہیں سارے دیپ سے
خود ہی اس میں آنے جانے لگتے ہیں

خود ہی گزرنے ہیں خود کو لمحوں میں
خود ہی اپنا کھوج لگانے لگتے ہیں

خود ہی شکوہ کرتے رہتے ہیں دل کا
خود ہی خود پر جھنجھلانے لگتے ہیں

خود ہی اک تصویر بناتے ہیں دل سے
خود ہی وہ تصویر بنانے لگتے ہیں

خود ہی آصف لکھتے ہیں تعبیر ان کی
خود ہی اپنے خواب چرانے لگتے ہیں

---

*

حرف تھا آصف جو زیبِ داستاں گم ہو گیا
ہم زمیں والوں کا گویا آسماں گم ہو گیا

ذہن پر سورج اتر آیا ہے تیری یاد کا
اتنی حدت ہے کہ ربطِ جسم و جاں گم ہو گیا

اُن سے پوچھیں گے بدلتے موسموں کی سرگزشت
دھوپ کے صحرا میں جن کا سائباں گم ہو گیا

کچھ ہمیں تو ہی بتا اے زندگی! اس موڑ پہ
تیری راہوں میں نشانِ کارواں گم ہو گیا

کیا کرے گا رہروانِ شوق کی وہ رہبری
رہزنوں کی بھیڑ میں جو پاسباں گم ہو گیا

ان دنوں گم ہے بھلا تو کن دیاروں میں شفیقؔ
میں تو اپنے دوستوں کے درمیاں گم ہو گیا

---

*

ہو نہ جائے زندگی کا عکس بھی معدوم پھر
کر رہا ہوں حادثات آرزو مرقوم پھر

ظلمتوں کا زہر اُترا تھا جو لمحوں میں کبھی
ہو گیا ہے روشنی کے نام سے موسوم پھر

جس کے بام و دَر کِئے تھے میں نے روشن، خون سے
لکھ رہا ہے تیرگی سے وہ مرا مقسوم پھر

عُمر بھر جس نے کِیا ہے چاہتوں کا قتلِ عام
پوچھتا ہے اب محبّت کا وہی مفہوم پھر

ایک مدت تک جو میری ذات سے غافل رہا
کر رہا ہے وہ مرے حالات کو معلوم ہے

ہو سکے تو نوکِ خنجر سے نئی تاریخ لکھ
وقت کہتا ہے فرازِ دار کو اب چوم لے

جب سے اُتری ہے مری آنکھوں میں ماضی کی کرن
جاگتی ہے دل میں آصفؔ خواہش موہوم پھر

*

دوستی میں دشمنی کا در تو وا ہونا ہی تھا
آخر اس شہر میں یہ حادثہ ہونا ہی تھا

تھا ہمیں شیشہ گروں کے قرب میں رہنے کا شوق
آئینہ تھے، پتھروں کا سامنا ہونا ہی تھا

پر گرہوں کون بتائے قفس کے حبس میں
کتنی سانسوں کے پرندوں کو رہا ہونا ہی تھا

چُن لیے تھے ابتدا میں اپنے اپنے راستے
اس مُسافت میں ہمیں اک دن جُدا ہونا ہی تھا

ڈھونڈتے پھرتے ہو کس کو گُلستاں در گُلستاں
وہ تو خوشبُو تھا اُسے صرف ہَوا ہونا ہی تھا

ہم کہ آوازوں کے سائے ساتھ رکھتے تھے بہت
اس حریمِ جاں کو آخر بے صدا ہونا ہی تھا

*

دِل اُس کی تمنّا کا سزاوار ہُوا تو
وہ میرے لیے باعثِ آزار ہُوا تو

صحرا کے تناظر میں جو بادل کی طرح ہے
وہ شخص اگر سایۂ دیوار ہُوا تو

رستہ بھی کوئی ہم کو دکھائی نہ پڑے گا
لمحوں کا تسلسل جو گراں بار ہُوا تو

ہم سوچیں گے کچھ اور سلگنے کا طریقہ
دِل سوز کی لذّت سے جو بیزار ہُوا تو

دل میں جو لیئے پھرتے ہیں جذبات کا دریا
آنکھوں سے اگر اپنی شرر بار ہُوا تو

جس شہر سے آصف ہمیں اُمیدِ سکوں ہے
وہ شہر اگر وقت کی رفتار ہُوا تو

---

*

تیری سوچوں پہ تو نفرت کا فسوں طاری ہے
میرا شیوہ تو محبّت کی شجر کاری ہے

جس نے سیکھا تھا تکلّم کا قرینہ مجھ سے
میرے لہجے سے وہ اک شخص بھی انکاری ہے

اُس نے ڈالی ہے مری ذات پہ غفلت کی ردا
پھر بھی آنکھوں میں مری صُبح کی بیداری ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

*

جو اپنی آنکھ میں چاہت کے خواب رکھتے ہیں
دُرونِ ذات وہ کیا کیا عذاب رکھتے ہیں

کرے ہوئے ہیں وہی ظلمتوں کے دریا میں
جو اپنی سوچ میں صد آفتاب رکھتے ہیں

بھٹکتے رہتے ہیں تشنہ لبی کے صحرا میں
نظر نظر میں جو حدِ سراب رکھتے ہیں

لہو لہو ہے انہیں سے چمن کا پیراہن
جو اپنے ہاتھ میں شاخِ گلاب رکھتے ہیں

تمہاری یاد کی سرگوشیوں کو بھر آئے
نوائے درد کا ہم بھی جواب رکھتے ہیں

وہی نقیب ہیں آصف نئے زمانے کے
گئی رُتوں کا جو ہر دم حساب رکھتے ہیں

---

*

پہلے اپنے خون میں پھیلی ہوئی نفرت نکال
پھر محبت کے حوالے میں کوئی وسعت نکال

تیرگی کے زہر میں ڈھل جائے نہ تیرا وجود
جس طرح ممکن ہو تہہ ذات سے ظلمت نکال

زندگانی کا تقاضا ہے دل بے تاب سن
کربلائے دہر میں جینے کی کچھ صورت نکال

منزلیں ہیں منتظر [illegible] وہ [illegible]
فکر کا تیشہ اٹھا اور آ [illegible] سے [illegible]

پھر کہیں بن جائے شاید آبرو سے زندگی
ہر خرابی کے اُفق سے پہلوئے زینت نکال

کاٹ لے تیشہ تم کو پھر رگِ جاں سے شفیق
جبر کے زندان سے انسان کی خدمت نکال

*

وقت کی بے نام گزری ساعتوں میں قید ہوں
شہرِ احساسات کے کن منظروں میں قید ہوں

کب تلک بھٹکوں گا میں نادیدہ منزل کے لیے
کیا مسافت ہے، سفر کے وسوسوں میں قید ہوں

سوچ کے صحرا میں اکثر بے طلب رہتا ہوں میں
جانے کیسی خواہشوں کے جنگلوں میں قید ہوں

دشمنوں کی دشمنی کا ذکر بے معنی سا ہے
میں تو اپنے دوستوں کی سازشوں میں قید ہوں

مُنقسم ہے کرب کے ماحول میں میرا وجُود
مَیں شکستِ خواب ہُوں اور رتجگوں میں قید ہُوں

صُبح کا سُورج دلائے گا رہائی لازماً
کیا ہُوا گر میں ابھی تک ظلمتوں میں قید ہُوں

غور سے کیا دیکھتا مَیں شہر کے منظر شفیق
دیدہ ور ہُوں اور اپنے آنسوؤں میں قید ہُوں

---

*

خُوں اپنا پلانا ہے، اور خُوب پلانا ہے
اے تشنہ لبی تیرا، ہر قرض چکانا ہے

دل کی بھی لہُو نہریں، گرتی ہیں یہیں آکر
یہ آنکھ دہانہ بھی، دریا کا دہانہ ہے

اب موت یقینی ہے، اس جبرِ مسلسل کی
وہ اُس کا زمانہ تھا، یہ میرا زمانہ ہے

جذبوں کے چراغوں کو، ہم اپنا لہُو دیں گے
اس دَور کی ظلمت کو، ہر طور مٹانا ہے

اک لڑکی سوچوں نے تخلیق کیا جس کو
چھوٹی سی کہانی ہے، چھوٹا سا فسانہ ہے

اک چہرہ بناؤں گا، میں لوحِ تمنّا پہ
پھر لوحِ تمنّا سے، اک چہرہ مٹانا ہے

یہ شام کا منظر بھی، ہے کتنا عجب صحف
بجھتی ہوئی آنکھوں میں، سورج کا زمانہ ہے

---

*

ریگِ دل پر جو تری یاد کے آہُو آئے
میری پلکوں پہ مچلتے ہُوئے جگنُو آئے

حُسنِ اظہار عطا کر مُجھے اے ربِّ ہُنر
میرے لفظوں سے مہکتی ہُوئی خوشبو آئے

مَیں نے چُپکے سے ترے ذہن کی تختی پڑھ لی
میرے شعروں میں تری سوچ کے پہلو آئے

میں بھی ہو جاؤں کبھی گامزنِ راہِ سلوک
کاش ہونٹوں پہ مرے نعرۂ ہاہو آئے

لوگ مشکیزہ لیے پھر سوئے دریا پہنچے
کام جس مرحلہ میں اک شخص کے بازو آئے

اپنے آئینِ تمنّا کا بھرم رکھ آصف
یہ نہ ہو لمحۂ تفریقِ من و تو آئے

*

اُس کے لہجے سا کہیں بھی بانکپن مِلتا نہیں
گُل رُخوں کی بھیڑ میں وہ گُلبدن مِلتا نہیں

جس کی خوشبو کے تعاقب میں ہے تنہائی کی شام
انجمن میں بھی وہ جانِ انجمن مِلتا نہیں

مِل تو جاتی ہے دکھاوے کی شناسائی بہت
اس جہاں میں پیار لیکن قیمتاً مِلتا نہیں

جب سے اترا ہے گلوں پر زرد موسم کا عذاب
ہم کو سارے گلستاں میں خوش سخن ملتا نہیں

کب سے اپنی خواہشوں کے بَن میں آوارہ ہوں میں
میری سوچوں کو صدا کا پیرہن ملتا نہیں

شخصیت سازی میں بھی کچھ وقت لگتا ہے شفیق
مرتبہ ملتا ہے لیکن دفعتاً ملتا نہیں

*

تھا جو پیکر عالمِ تمثیل میں
آ گیا ہے چشمِ تر کی جھیل میں

میرے دِل کا پوچھتے ہیں مجھ سے آپ
میرا دِل ہے آپ کی تحویل میں

جس کی سانسوں میں ہے خوشبوئے وصال
ہے وہ منظر لمحۂ تکمیل میں

آپ جو چاہیں روا رکھیں سلوک
سر بہ سر حاضر ہیں ہم تعمیل میں

جانے کیوں اس دور کا ہر آدمی
محو ہے انسان کی تذلیل میں

بات اُن سے مختصر کیجئے شفیق
پڑ رہے ہو کس لئے تفصیل میں

---

*

محبتوں کا مری جاں کوئی حساب نہیں
مرا وجود ہے تو میرا انتخاب نہیں

عجیب رنگ خد و خال میں گھلا اپنے
تری مثال نہیں ہے مرا جواب نہیں

جمی ہوئی ہیں طنابیں وفا کے خیموں کی
ہوائے دشت میں پہلا سا اضطراب نہیں

نجانے کون سے موسم کی ہیں اسیری میں
صبا کے ہاتھ میں اب کوئی بھی گُلاب نہیں

کتابِ درد کے بے نام سے حوالوں میں
ہمارا نام تو ہے، حرفِ انتساب نہیں

کُھلی جو آنکھ تو سب ہم پہ کُھل گیا آصف
عذابِ خواب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

---

*

بحرِ غم کا کٹاؤ کیسا ہے
آنسوؤں کا بہاؤ کیسا ہے

ہم تو رہتے ہیں قریۂ غم میں
حال اپنا سناؤ کیسا ہے

جس سے بچھڑے ہمیں زمانہ ہُوا
وہ شناسا بتاؤ کیسا ہے

تُم کہ مردم شناس تھے اتنے
پھر یہ سینے پہ گھاؤ کیسا ہے

اُس سے ملا کر فریب اُس کا ہوں
جانے اُس سے لگاؤ کیسا ہے

میرے الفاظ میں تمہارے لئے
چاہتوں کا رچاؤ کیسا ہے

تم جو اتنے انا کے داعی تھے
اُس کی جانب جھکاؤ کیسا ہے

سارے جذبے جُھلس گئے آصف
میرے اندر الاؤ کیسا ہے

---

*

زندگی کی رہگزر ہو اور تُو ہو
اور نہ کوئی ہمسفر ہو اور تُو ہو

چاند میرے رتجگوں کا آئینہ ہے
آج پھر وہ جلوہ گر ہو اور تُو ہو

تیرا پیکر ہو نظر کی دسترس میں
ایک میری چشمِ تر ہو اور تُو ہو

ختم بھی ہو ریگزاروں کی مُسافت
کاش پنا کوئی گھر ہو اور تُو ہو

مُوئے خامہ خود تراشے خال و خد کو
کوئی ایسا بھی ہُنر ہو اور تُو ہو

گفتگو کے پھول جاگیں آنِ آصف
میرے لفظوں میں ثمر ہو اور تُو ہو

---

*

ضبط کی گہرائی سے حرفِ بیاں تک آ گئے
رفتہ رفتہ دل کے فسانے زباں تک آ گئے

چاند سے پھر تازہ یادوں کی بدلی آ گئی
برف جذبے آج پھر شہرِ بتاں تک آ گئے

آندھیوں کی زد میں سب گل پیرہن بھی آئیں گے
کچھ بگولے پھر فصیلِ گلستاں تک آ گئے

یہ جو برگد میں دسی ہے سے تم ڈھونڈ لو
شام کو جس دم پرندے آشیاں تک آ گئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

*

بینائی کھو رہی ہے لمحوں کی تیرگی سے
ماحول کو جلائیں سوچوں کی روشنی سے

اس دورِ پُرفتن میں حیوان بن گیا ہے
فطرت کو جانے کیا تھی اُمّید آدمی سے

منزل نے تو پکارا ہم کو قدم قدم پر
بھٹکے رہے مگر ہم اپنی ہی کج روی سے

رکھتے ہیں سامنے ہم اُلفت کے سب قرینے
کرتے ہیں یاد تجھ کو اے دوست خامشی سے

ہم مفلسوں کی یُوں بھی بے کار ہے جوانی
راحت کِسے ملی ہے سرما کی چاندنی سے

سمٹے ہیں فاصلے بھی یُوں تو شفیق آصفؔ
پھر دُور ہو گیا ہے اِنسان زندگی سے

کر محبت عطا کرے کوئی
دل کی خواہش ملا کرے کوئی

دل میں تروں گا صورت خوشبو
ہاں، دریچہ تو وا کرے کوئی

قید ہوں کب سے چپ کے گنبد میں
مجھ میں آئے، صدا کرے کوئی

کون رسوا ہے اس کی گلیوں میں
ہم کو کیا ہے، ہوا کرے کوئی

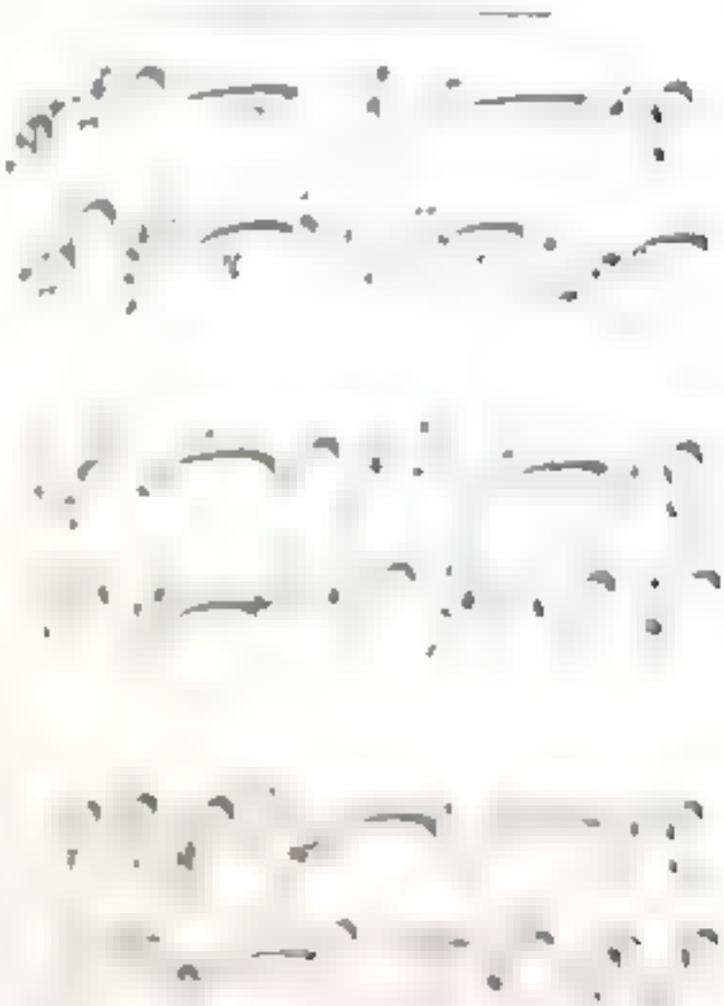

*

دِل کی دُنیا کا پاسباں کہہ دوں؟
تجھ کو تسکینِ رُوح و جاں کہہ دوں؟

جو تری یاد میں نہیں گُزرے
ایسے لمحوں کو رائیگاں کہہ دوں؟

جو تری رہگزر میں آتے ہیں
ایسے ذرّوں کو کہکشاں کہہ دوں؟

روک لیتے ہیں دُھوپ کی حدّت
بادلوں کو مَیں سائباں کہہ دوں؟

وہ جو تاریخ کا حوالہ ہیں
اُن کو آوازِ رفتگاں کہہ دوں ؟

آپ کیا میرا راز رکھ لیں گے ؟
آپ کو اپنا رازداں کہہ دوں ؟

رُوبرُو ہیں وہ اب شفیقؔ آصف
زندگی کو میں جاوداں کہہ دوں ؟

---

*

اپنے کئی پیکر ہیں برائے کئی پیکر
احساس کی دنیا میں بسائے کئی پیکر

جب آنکھ دریچے میں کوئی عکس نہ اترا
پھر ہم نے تخیل میں بنائے کئی پیکر

ہے سلسلہ در سلسلہ تعبیر محبت
سوئے ہوئے خوابوں سے جگائے کئی پیکر

جب لوحِ تمنا پہ بنایا ترا چہرہ
پھر لوحِ تمنا سے مٹائے کئی پیکر

جس وقت میں پہنچا تھا سر کوچۂ قاتل
رہ رہ کے مرے سامنے آئے کئی پیکر

پھر دشتِ تحیّر سے ترا نقش ملا ہے
پھر دشتِ تحیّر سے اُٹھائے کئی پیکر

جب یاد کیا اُن کو کبھی خواب میں آصفؔ
پھر خواب جھروکوں میں بھی آئے کئی پیکر

---

*

جب سورج نے اوڑھا بادل
برسا دریا دریا بادل

ہم بھی روئے وہ بھی رویا
ساتھ ہمارے رویا بادل

خوابوں کی دہلیز پہ ہم نے
دیکھا سویا سویا بادل

جب آنکھوں نے سپنے دیکھے
پھر پلکوں نے لاتعداد بادل

جانے کیوں اتنا لگتا ہے
گیسو گیسو پیدا بادل

جب آصف میں گھر سے نکلا
ساتھ مرے چل نکلا بادل

---

*

دشت کی جانب ہم کو نکلے ایک زمانہ بیت گیا
اپنے شہر کے منظر دیکھے ایک زمانہ بیت گیا

تُو ہی میری سوچوں اور شعروں کا محور ہوتا ہے
تیری یاد میں غزلیں کہتے ایک زمانہ بیت گیا

اور بھی کوئی صُورت نِکلے دل کی باتیں کہنے کو
دیواروں پر لِکھتے لِکھتے ایک زمانہ بیت گیا

دِل کو دل سے رہ کب ہوگی کب جذبے مُسکائیں گے
درد کے رستے چلتے چلتے ایک زمانہ بیت گیا

اُن سے بھلا کیا غُنچہ و گُل کی، بادِ صبا کی بات کریں
جن کو اپنی آگ میں جلتے ایک زمانہ بیت گیا

جانے کب پہچانیں گے ہم آصفؔ اپنی منزل کو
وقت کی موج میں بہتے بہتے ایک زمانہ بیت گیا

---

*

دوستوں میں کہ دشمنوں میں ہیں
ہم زمانے کی گردشوں میں ہیں

ہجرتیں ہم کو راس آتی تھیں
اب پریشاں بھی ہجرتوں میں ہیں

کچھ تو بکھرے تھے شب کے دامن پہ
اور کچھ خواب رتجگوں میں ہیں

کتنے چہرے تھے زینتِ محفل
کتنے چہرے جو آنسوؤں میں ہیں

ہیں یقیناً وہ منزلوں کے نقیب
جو مسافر نہ راستوں میں ہیں

تیرے جانے کے بعد اے آصف
اک زمانے سے وحشتوں میں ہیں

---

*

زندگی کے خمار سے گُزرے
جب ترے انتظار سے گُزرے

تم نے دیکھا نہیں سرِ مقتل
لوگ کتنے وقار سے گُزرے

ایسے گُزرے ہم اپنی ہستی سے
پھُول جیسے بہار سے گُزرے

کتنے چہرے تھے گرد سے عاری
قافلے تو غبار سے گزرے

آئنے چاند صورتیں لے کر
چاہتوں کے شمار سے گزرے

ہم بھی شامل تھے اُن میں اے آصف
جیت کر بھی جو ہار سے گزرے

---

*

زندگی تیرا ثمر اچھا لگا
ہم کو لفظوں کا ہنر اچھا لگا

چاند سی کچھ صورتوں کے باوجود
اک ستارہ بام پر اچھا لگا

آج اس نے غور سے دیکھا مجھے
آج یہ حسنِ نظر اچھا لگا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

---

*

نظر دَر نظر یُوں تو چہرے بہت ہیں
مگر کیسے کہہ دوں کہ تجھ سے بہت ہیں

یہ کس برف پیکر نے تجھ کو چھُوا ہے
بتا کیُوں ترے ہاتھ ٹھنڈے بہت ہیں

کبھی ہم نشیں تھے، زمانے ہمارے
مگر آج کل ہم اکیلے بہت ہیں

کوئی بھی جواب اُس طرف سے نہ آیا
اگرچہ خطوط اُس کو لکھے بہت ہیں

ابھی تشنہ لب ہیں مرے دل کے جذبے
فراتِ تمنا پہ پہرے بہت ہیں

الگ بات بچتے رہے یار آصفؔ
کمیں گاہ سے تیر آئے بہت ہیں

---

*

آنکھ میں کیسا سپنا جاگا
جذبوں کا اِک دریا جاگا

نیندیں اوڑھ کے سوئے سارے
اور مَیں شب بھر تنہا جاگا

نیند میں گُم تھے جب ہمراہی
ساتھ ہمارے رستہ جاگا

شب بھر ہم کو نیند نہ آئی
دل میں درد اِک ایسا جاگا

کیا کرتیں تدبیریں اپنی
بخت ہی رفتہ رفتہ جاگا

گلشن جب مدہوش تھا آصف
شاخ سے گرتا پتّہ جاگا

---

*

تیرے لَوٹ آنے کی، یہ بھی اِک نشانی ہے
موسموں کے ہونٹوں پر، پیار کی کہانی ہے

اصل میں ستارہ ہے، حسرتوں کے صحرا کا
یہ جو میری آنکھوں میں، جھلملاتا پانی ہے

یہ جو تیری آنکھوں میں، عکس ہے گُلابوں کا
یہ بھی میرے شعروں کی، بیکراں جوانی ہے

زندگی کے بارے میں، بات ہے تو اتنی سی
صبح کا فسانہ ہے، شام کی کہانی ہے

میرا خوں بھی شامل ہے، میرے سارے حرفوں میں
موج میں طبیعت ہے، سوچ میں روانی ہے

آدمی کو اب کیسے، میں خدا کہوں آصف
بے ضمیر لوگوں سے، دشمنی پرانی ہے

---

*

ہر ایک شاخِ چمن زار پر نکھار آیا
خزاں کا دَور گیا عہدِ نَو بہار آیا

کِسی کے لمس کی خوشبُو ہے مِری سانسوں میں
حریمِ جاں میں مِری کون مُشکبار آیا

مَیں سوچتا رہا اکثر کہ تُجھ سے پُوچھوں گا
مِری طرف سے ترے دِل میں کیُوں غبار آیا

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں یارب
تری خدائی میں کیا دورِ اِنتشار آیا ؟

تمھارے شہر کی بے کیف محفلوں کی قسم
مَیں بے قرار گیا اور بے قرار آیا

جو صُورتیں مرے دِل میں بسی ہُوئی تھیں شفیقؔ
قلم سے صفحۂ قرطاس پہ اُتار آیا

---

*

جب ہم شفیق واقفِ جذبات ہو گئے
آنکھوں میں اُن سے کتنے سوالات ہو گئے

لکھے ہوں جیسے مَیں نے ترے دل پہ سب حروف
مُجھ ایسے آج تیرے خیالات ہو گئے

کل تک تھا جن کو میرے مُوقف سے اختلاف
پھر یُوں ہُوا کہ وہ بھی مِرے ساتھ ہو گئے

جانے یہ آج کس کی دُعائیں ہیں ساتھ ساتھ
حیراں ہُوں آج کتنے مرے ہاتھ ہو گئے

ہر شخص اپنی ذات میں تنہا ہے ان دنوں
کچھ ایسے اپنے شہر کے حالات ہو گئے

اَب ڈھونڈتا ہے اُن کو کہاں، کس لیے شفیقؔ
جو لوگ تجھ سے مل کے تیری ذات ہو گئے

---

*

جو سُود و زیاں کو کبھی دیکھا نہیں کرتے
وہ لوگ وفاؤں کو تماشا نہیں کرتے

عُشّاق کی چاہت کا یہی پہلا سبق ہے
تفریقِ محبت میں گوارہ نہیں کرتے

آجائے جنھیں کارِ محبت کا قرینہ
رُسوا تو وہ ہو جاتے ہیں رُسوا نہیں کرتے

سوچوں میں بپا رہتا ہے یادوں کا تلاطم
آنکھوں کو مگر صورتِ دریا نہیں کرتے

ہو جائے اگر جن سے کبھی دل کا تعلّق!
بچھڑیں گے کبھی اُن سے، یہ سوچا نہیں کرتے

واقف ہُوں ہواؤں کی شکستوں سے جو آصفؔ
وہ نام کبھی ریت پہ لکھا نہیں کرتے

---

*

ملن رُت کو دِل سے نکالا نہیں ہے
ابھی غم کو سانچے میں ڈھالا نہیں ہے

اندھیرے جہالت کے طاری ہیں ہر سُو
جہاں میں ابھی تک اُجالا نہیں ہے

یہاں آدمی، آدمی کا ہے دُشمن
یہ انسانیت کا حوالہ نہیں ہے

تصور ترے حُسن کا ہے ازل سے
مَیں کیسے کہوں دیکھا بھالا نہیں ہے

بہت کیف پرور ہے تیرا تبسّم
مگر یہ غموں کا ازالہ نہیں ہے

نہ اُجلا سہی تیرے آصفؔ کا چہرہ
یہ کم ہے، کہ دِل کا وہ کالا نہیں ہے

---

*

کوئی بھی تجھ سا یہاں شہر میں قاتل نہ ہُوا
یعنی پتھر ہُوا سینے میں ترے، دل نہ ہُوا

یادِ رفتہ کے زمانے سے بھی قائل نہ ہُوا
وہ کسی طور بھی پہچان پہ مائل نہ ہُوا

یہ الگ بات زبانوں پہ رہے ہیں پہرے
باوجُود اس کے بھی لہجہ مِرا زائل نہ ہُوا

گامزن قافلے جذبوں کے رہے جس کے لیے
پیار کی راہ میں وہ بھی مری منزل نہ ہُوا

میرے جذبوں کے سوا طرزِ نگارش میں مری
کوئی مانگا ہُوا لہجہ کبھی شامل نہ ہُوا

تجھ میں وہ کون سے جوہر تھے نہ جانے آصفؔ
تیرا دُشمن جو ترے مدِّ مقابل نہ ہُوا

---

*

اب فصیلِ تیرگی میں در اُٹھانا چاہیئے
شب کے آنگن میں کوئی سُورج اُگانا چاہیئے

چل رہی ہُوں جس جگہ پر نفرتوں کی آندھیاں
ایسی بستی سے مُسافر لَوٹ جانا چاہیئے

جو علامت ہو بہارِ جانفزا کے رنگ کی
پھُول اِک ایسا بھی کالر میں سجانا چاہیئے

جس جگہ سجدوں کو مل جاتی ہے منزل عشق کی
ایسے سنگِ در پہ اپنا سر جھکانا چاہیئے

خود نمائی کے ہیولوں کو سرِ راہِ طلب
جو ہنر اہلِ وفا کا ہے سکھانا چاہیئے

ساتھ کچھ ممکن نہیں ہے اے شفیق
چند رشتوں کو بنانے میں زمانہ چاہیئے

---

*

جھیلنا ہے وقت کے طوفان کو تنہا مجھے
پھر رہا ہے اپنے کاندھوں پر لیئے دریا مجھے

مجھ کو اپنے آپ سے ہے بے نیازی کا گلہ
مل گیا ہے زندگی میں حُسنِ بے پروا مجھے

سو رہا تھا میں تو شامِ غم کی نیندیں اوڑھ کر
کر گیا بیدار کس کی یاد کا جھونکا مجھے

کب ترے معیار پر پورا نہیں اترا ہوں میں
رہگزارِ زیست میں تو نے جہاں پرکھا مجھے

آخری سانسوں کا میری انگلیوں میں ہے قلم
اس نے اپنے آخری خط میں یہی لکھا مجھے

جانے کیسی تشنگی تھی اس کی آنکھوں میں شفیقؔ
دیکھتے ہی دیکھتے وہ کر گیا صحرا مجھے

---

*

دِل کا ہُوا حساب غمِ رُوزگار سے
باہر نِکل کے دیکھ دُکھوں کے حصار سے

اِس طرح اپنی ذات میں تنہا ہے آدمی
بچھڑی ہو جیسے کُونج کوئی اپنی ڈار سے

حالانکہ عشرتوں کا زباں در زباں ہے ذکر
کیا جانے پھر بھی لوگ ہیں کیوں سوگوار سے

زر کے بُتوں کو پُوجنے والو ذرا سنو !
تُم کچھ نہ پا سکو گے وفا کے دیار سے

ہے دشتِ آرزُو میں مری سوچ اِس طرح
بکھرا ہو جیسے پھُول ہَوائے بہار سے

آصفؔ جنُوں کی تُند ندی میں اُتر کے دیکھ
دامن ہے گرد گرد خرد کے غبار سے

---

*

پیاسوں کی زندگی میں بلا کے عذاب تھے
دریا جو سامنے تھے وہ سارے سراب تھے

کرتا شمار کون ستم آسمان کے!
کیسا حساب! رنج و الم بے حساب تھے

خرگوش طبع راہ میں سوتے ہی رہ گئے
اور جو رواں دواں تھے وہی کامیاب تھے

جو آگ کی تلاش میں پہنچا تھا طور پر
اُس کی ہتھیلیوں پہ کئی آفتاب تھے

اے کاش سطحِ آب سے اندازہ کرتے ہم
طوفانِ تیز و تُند کئی زیرِ آب تھے

خوشبُو ہے اُن کی آج بھی احساس میں شفیقؔ
وہ بے نقاب چہرے جو مثلِ گلاب تھے

---

*

ہماری پیاس کو دہکا گیا ہے
تمھارے ساتھ جو دریا گیا ہے

تمھاری نفرتوں کے وار سہہ کر
محبت کا قرینہ آ گیا ہے

تمھیں کیوں تشنگی سے خوف آئے
ہمارے ساتھ ہی صحرا گیا ہے

سُنا ہے نام تیرا اور میرا
ہَوا کے ہاتھ پر لکھا گیا ہے

پگھلنے لگ گئے ہیں موم پیکر
"سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے"

مہکتا تھا جو دشتِ جاں میں آصفؔ
ہوائے سرد سے مرجھا گیا ہے

---

*

ہر سُو تنہائی کے تارے روتے تھے
رات گئے جب گھر کو واپس لَوٹے تھے

آخر اپنی بینائی تو چھننی تھی !
روشنیوں کے خواب جو ہم نے دیکھے تھے

خُود ہی دفن کیا تھا اپنی لاشوں کو
خُود ہی ہم نے اپنے نوحے لکھّے تھے

جانے کس جانب سے آندھی آئی تھی
جانے کتنے پتّے شاخ سے ٹوٹے تھے

اب اِس کی بربادی پر یہ رونا کیا
جیسی بستی! ویسے ہی رکھوالے تھے

جن کی کھوج میں بھٹکے تھے ہم مدت تک
جانے کیسے وہ گمنام جزیرے تھے

جن کو ماضی کی یادیں دُہراتی ہیں
میری مٹھی میں آصف وہ لمحے تھے

---

*

آئنہ جس نے توڑ ڈالا تھا
اپنی بے چہرگی سے ڈرتا تھا

دستکیں خواب میں جو دیتا تھا
اِک شگفتہ ہوا کا جھونکا تھا

دِل میں آوازِ درد اُتری تھی
مَیں حصارِ اَنا سے نِکلا تھا

پیاس ہونٹوں پہ جم گئی اُن کے
رُوبرو جن کے بہتا دریا تھا

دھوم تھی شہر میں بہاروں کی
صحنِ گلشن میں رنگِ صحرا تھا

تشنہ دھرتی نہ ہو سکی سیراب
بارہا گرچہ ابر برسا تھا

ہم ملے تھے شفیق آصف سے
تیری یادوں میں شعر کہتا تھا

*

کچھ ایسا زندگی کا ستارا مجھے ملا
اِک بار جو ملا وہ دوبارہ مجھے ملا

تنہائیوں کی شام ملی جب کبھی مجھے
پھر تیری یاد کا ہی سہارا مجھے ملا

بے اختیار ہنستی ہیں آنکھوں کی پتلیاں
تُو آ رہا ہے اِس کا اشارہ مجھے ملا

پگھلنے لگی تھی ذہن پہ جب برف کی تہ
تیرا خیال بن کے شرارہ مجھے ملا

تم مل گئے تو ساحلِ امید بن گیا
ہر موجِ تند خو میں کنارا مجھے ملا

سب کچھ لٹا کے پھر بھی ہوں میں شاد اے شفیق
یہ کیسا چاہتوں میں خسارہ مجھے ملا

---

*

وہ اندھیرے ہیں یا اُجالے ہیں
سارے لمحے ترے حوالے ہیں

بندگانِ وفا نے دانستہ
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

طائرِ فکر کس فضا میں اُڑے
پَر فضاؤں نے کاٹ ڈالے ہیں

آج سُورج ہے قید میں شاید
آج بادل سروں پہ کالے ہیں

کج روی، افتراق و محرومی
سب اِسی عہد کے حوالے ہیں

کیسا آذر ہے وقت بھی آصفؔ
جس نے دل پتھروں میں ڈھالے ہیں

---

*

اس ادا سے بھی دِلربائی کر
میرے زخموں کی رُونمائی کر

ٹُوٹ جائے نہ رسمِ اہلِ وفا
ہر کسی سے نہ آشنائی کر

محوِ آئینۂ خیال کبھی
میرے جذبات تک رسائی کر

مہر و اخلاص کے وسیلے سے
سارے ذہنوں پہ تُو خدائی کر

ہیں کٹھن سلسلے محبّت کے
اے غمِ عشق رہنمائی کر

کجکلاہی کے واسطے آصفؔ
کاسہ بردار بن، گدائی کر

---

*

یہ ٹوٹی پھوٹی جو کشتیاں ہیں
گزشتہ طوفان کے نشاں ہیں

پرند برگد میں چھپ رہے ہیں
یہ آندھیاں کیسی آندھیاں ہیں

ہوا کے جھونکے یہ پوچھتے ہیں
فلک فلک کیسی بدلیاں ہیں

زمیں کو جھک کر جو چومتی ہیں
شجر کی پھلدار ٹہنیاں ہیں

چھلکتے جذبوں کی صورتوں میں
سفید باہنوں میں چوڑیاں ہیں

وفا کی تاریخ لکھ رہا ہوں
لہو لہو میری انگلیاں ہیں

یہ شعر گوئی کے رنگ آصفؔ
مری محبت کے ترجماں ہیں

*

ترکِ تعلقات کا امکاں نہیں رہا
وہ مُجھ سے اِس قدر بھی گریزاں نہیں رہا

دِل میں اُتر گیا ہے مِرے نشترِ خزاں
یعنی کوئی بہار کا ساماں نہیں رہا

کرتے رہے ہیں اپنے لہُو سے جسے رقم
اُس داستاں کا اَب کوئی عُنواں نہیں رہا

دِل میں نہیں رہی ہے تمنائے رنگ و بُو
آنکھوں میں جب سے جلوۂ جاناں نہیں رہا

وہ التفاتِ غم کا سزاوار ہی نہیں
جو غم کی آندھیوں سے پریشاں نہیں رہا

ہم کشتیاں جلا کے نکل آئے ہیں شفیق
اَب واپسی کا کوئی بھی اِمکاں نہیں رہا

---

*

اُس کی آنکھوں کا جو دریا دیکھنا
میری آنکھوں کا بھی صحرا دیکھنا

دیکھنا جب صُبحِ نَو کی تازگی
شامِ غم کا بھی ستارا دیکھنا

چاند اُبھرا ہے شفق کی جھیل سے
آج تم اپنا سراپا دیکھنا

میری آنکھوں میں کبھی تُم جھانک کر
اپنی صُورت کا اُجالا دیکھنا

وقت نے جو بھی کیا ہے فیصلہ
وقت کے چہرے پہ لکھا دیکھنا

دیکھ لیں ہم نے تُمھاری چاہتیں
اور قسمت میں ہے کیا کیا دیکھنا

سچ بتا آصفؔ تجھے کیسا لگا
گھر جلا کر خُود تماشا دیکھنا

---

*

آنسوؤں کی بارشوں سے جسم جل تھل ہو گیا
رونقوں سے رابطہ اپنا معطّل ہو گیا

گر رہی ہے برف تیری یاد کی، دہلیز پر
پھر مری سوچوں کا دروازہ مقفّل ہو گیا

عُمر بھر جس کی تمنّا سے گریزاں ہم رہے
جانے کیوں وہ شخص اپنا آج سانول ہو گیا

جو بتاتا تھا شعور زیست کے معنی ہمیں
دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص پاگل ہو گیا

شہر جاں میں اب کے ایسی آندھیاں اٹھیں شفیق
زندگی کا گنگناتا شہر جنگل ہو گیا

خواہشوں کی قید سے نکلیں کسی صورت شفیق
خواہشوں کی یورشوں سے ذہن بوجھل ہو گیا

---

*

جو تیری محبت میں گرفتار ہُوئے ہیں
وہ لوگ تو رُسوا سرِ بازار ہُوئے ہیں

منزل کا تعیّن بھی کیا ہے کبھی ہم نے
کس کھوج میں یہ قافلے تیار ہُوئے ہیں

کس طور شبِ ہجر کٹی اُن کو خبر کیا
جو لوگ ابھی نیند سے بیدار ہُوئے ہیں

اِک عمر سے خالی تھے مری آنکھ کے روزن
اِمساں چراغوں سے ضیا بار ہوئے ہیں

کچھ شب کی سیاہی ہیں کمی آنے لگی ہے
کچھ دن کے اُجالے بھی نمودار ہوئے ہیں

پہلے بھی کبھی درد کا ادراک تھا آصف
یا آج ہی اس کیف سے دوچار ہوئے ہیں

---

*

اب وہ پہلی سی کہانی بھی نہیں
یاد کی کوئی نشانی بھی نہیں

رکھ رہا ہوں ایک ساون خواب میں
اور پھر آنکھوں میں پانی بھی نہیں

کانپتی ہے کیوں بھلا میری نظر
سامنے اُس کی جوانی بھی نہیں

کیوں ہوا کے رخ پہ ہوں محوِ سفر
میری کشتی بادبانی بھی نہیں

کس لئے پھر دل لگاؤں میں یہاں
زندگی جب غیر فانی بھی نہیں

اب شفق بھی پہلے جیسی ہے کہاں
شام ہے، لیکن سُہانی بھی نہیں

کشتیاں بھی بدلی بدلی ہیں شفیقؔ
پانیوں میں وہ روانی بھی نہیں

---

*

آرزوئے جاں کے جب سے رابطے کم ہو گئے
ایسے لگتا ہے کہ اپنے حوصلے کم ہو گئے

ہم نے منظر کی کشش کو اپنی آنکھیں سونپ دیں
صورتوں کی بھیڑ میں جب آئنے کم ہو گئے

چل رہی ہیں دشتِ جاں میں دُوریوں کی آندھیاں
جانے کیسے چاہتوں کے سِلسلے کم ہو گئے

پھر فصیلِ جاں سے ابھرا اک مکمل آفتاب
روشنی بڑھنے لگی تو حادثے کم ہو گئے

شہر میں بپھری ہوئی تھی بدگمانی کی ہوا
اور چراغِ عزم سے کچھ واہمے کم ہو گئے

اب مسافر سے سفر آغاز ہوتا کیوں نہیں
اب تو آصف راستوں کے وسوسے کم ہو گئے

---

*

زندگی کو امتحاں در امتحاں رہنے دیا
دوستوں اور دشمنوں کے درمیاں رہنے دیا

ہم کسی سے داستانِ دل کہیں تو کس طرح
تم نے اِس قابل بھی اے ظالم کہاں رہنے دیا

بھول سکتے تھے کہاں حُسنِ جہاں آرا کو ہم
جس نے آنکھوں میں محبت کا جہاں رہنے دیا

کیا خبر کب کوئی قیسِ عامری آئے اِدھر
اپنے خوں سے ہم نے نقشِ جاوداں رہنے دیا

کتنے پنچھی تھے کہ جو مجبورِ ہجرت ہو گئے
اور مشیت کے سہارے آشیاں رہنے دیا

کیا ستائے گی کڑکتی دُھوپ آصفؔ روح کو
یاد کے بادل نے سر پہ سائباں رہنے دیا

---

*

دِل جو صرفِ نظر نہیں ہوتا
آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا

خاک پر کس طرح بکھرتا ہے
پھُول جو شاخ پر نہیں ہوتا

ہم ہیں زندانی ایسے زنداں کے
جس کا کوئی بھی دَر نہیں ہوتا

راستے گنگنانے لگتے ہیں
جب کوئی ہم سفر نہیں ہوتا

مُفلسی جن کے پاس ہوتی ہے
اُن کو لُٹنے کا ڈر نہیں ہوتا

جس کے سینے میں آگ ہو آصفؔ
وہ کبھی بے اثر نہیں ہوتا

---

*

درد لمحوں میں بھر گیا کوئی
مجھ کو تنہا سا کر گیا کوئی

خُون بکھرا ہے ساری پٹڑی پر
جیسے جاں سے گُزر گیا کوئی

تیرگی کی ردا نہیں باقی
چاند آنگن میں دھر گیا کوئی

ہم کو فرزانگی کا دعویٰ تھا
پَل میں دیوانہ کر گیا کوئی

ایک محجوب آرزُو لے کر
غم کی تہہ میں اُتر گیا کوئی

منزلیں یُوں اُداس ہیں آصفؔ
جیسے راہوں میں مَر گیا کوئی

---

*

ظُلمت جب تنویر رہے گی
دِل کی کیا توقیر رہے گی

راہِ طلب میں چلنے والو!
پاؤں میں زنجیر رہے گی

جن آنکھوں میں خواب رہیں گے
اُن کے لِئے تعبیر رہے گی

تیرے اندر کی ہر چاہت
چہرے پر تحریر رہے گی

صحرا، صحرا، دریا، دریا
سسّی، سوہنی، ہیر رہے گی

درد کی دولت لے لو آصفؔ
لفظوں میں تاثیر رہے گی

---

*

ظلمتوں سے رہائی ہو جائے
روشنی تک رسائی ہو جائے

موسمِ گُل ہے اپنے جوبن پر
زخم کی رُونمائی ہو جائے

لمحہ بھر تُجھ کو بھی بھُلا بیٹھوں
تُجھ سے کچھ بے وفائی ہو جائے

کیا خبر تھی کہ یوں بھی ہونا تھا
بھائی سے دُور بھائی ہو جائے

آپ تھوڑی سی گر توجہ دیں
میری مُشکل کُشائی ہو جائے

کاش ایسا بھی ہو شفیق آصف
سچ کی ہر سُو خدائی ہو جائے

---

*

جو دِل کو کسی طور کُشادہ نہیں کرتے
ہم اُن سے ملیں ایسا ارادہ نہیں کرتے

اپنوں سے جو لیتے نہیں ہم عارضی خوشیاں
غیروں سے بھی ہم لوگ اِفادہ نہیں کرتے

کُچھ ہم نے بھی اوڑھی ہیں تکلّف کی رِدائیں
کچھ وہ بھی روایات کو سادہ نہیں کرتے

وہ [illegible] نہیں [illegible]
اور [illegible] نہیں [illegible]

جو طرز تخیل کو پرواز [illegible]
ہم ایسے نصابوں کا [illegible] نہیں کرتے

آجائے جنہیں آنکھوں سے پینے کا سلیقہ
آصف وہ کبھی خواہش بادہ نہیں کرتے

---

*

تیرہ شبی میں اُس سے اُجالا نہ ہو سکا
دِل جل کے روشنی کا حوالہ نہ ہو سکا

اُڑتا رہا ہوائے زماں کے حصار میں
لیکن وہ شخص پھر بھی ہمالہ نہ ہو سکا

وابستگی رہی ہے مجھے اس سے عُمر بھر
لیکن وہ میرا چاہنے والا نہ ہو سکا

وہ تو تمام عمر رہا قید ذات میں
اُس سے کسی کے غم کا ازالہ نہ ہو سکا

کچھ تیری سرگزشت انوکھی نہیں رہی
کچھ میرا واقعہ بھی نرالا نہ ہو سکا

آصفؔ کے حرف حرف میں حُسنِ تمام تھا
پھر بھی وہ میرے چاند کا ہالہ نہ ہو سکا

---

*

اُس کا ہے انتظار پھر شاید
دِل ہُوا بے قرار پھر شاید

سِسکیاں سُن رہا ہوں میں شب کی
چاند ہے سوگوار پھر شاید

نقشِ پا ڈھونڈتا ہے گلیوں میں
راستے کا غبار پھر شاید

آنسوؤں کی طلب ہے آنکھوں کو
وقت ہے شعلہ بار پھر شاید

اپنے خوابوں کے در کھلے رکھنا
آنے والا ہے یار پھر شاید

زخم پھر لب کشا ہوئے آصفؔ
آ رہی ہے بہار پھر شاید

*

رہا ہوں کرب کی لہروں سے ہمکنار اب تک
ستا رہا ہے مجھے موسمِ بہار اب تک

ٹھہر گیا ہے ترا انتظار آنکھوں میں
گیا نہیں مری آنکھوں سے انتظار اب تک

چمن اُجاڑ کے آندھی تو جا چکی لیکن
پرند پیڑوں میں بیٹھے ہیں بے قرار اب تک

یہاں شگفتہ ہواؤں کا کون طالب ہے
یہاں تو حبس کا موسم ہے سازگار اب تک

ہے اب بھی وقت اندھیروں کو مات دینے کا
رواں ہے شب کے اسیروں میں یہ پکار اب تک

وہ شخص لوٹ کے آ بھی چکا مگر آصفؔ
سوار ہے تری سوچوں پہ برف زار اب تک

---

*

ذہنوں پہ مسلّط ہے جو ڈر کاش چلا جائے
ایسا نہیں اِمکان تو سر کاش چلا جائے

اے کاش کبھی لَوٹ کے آ جائے ملن رُت
اس موسمِ ہجراں کا اثر کاش چلا جائے

باہر کی فضاؤں میں ہیں آسیب کے پہرے
ہر شخص کی خواہش ہے کہ گھر کاش چلا جائے

رستے میں کسی موڑ پہ آ سکتا ہے صحرا
لے آ بر سے کچھ زادِ سفر، کاش چلا جائے

ماحول میں پھیلا ہوا نفرت کا اندھیرا
جس سمت سے آیا ہے اُدھر، کاش چلا جائے

راس آیا نہیں عالمِ امکاں ابھی آصف
اس عالمِ امکاں سے بشر کاش چلا جائے

---

*

شبنم بدوش شعلہ بیانی کے سلسلے
ہیں ساتھ ساتھ آگ اور پانی کے سلسلے

مثلِ نسیم گزرے ہیں گلزارِ زیست سے
بچپن کے سلسلے کہ جوانی کے سلسلے

لوگوں کو جیسے شہر سے اُلفت نہیں رہی
جاری ہیں اَب تو نقلِ مکانی کے سلسلے

کتنے ہیں کربناک مرے دیس میں ابھی
آزادیوں میں ریشہ دوانی کے سلسلے

اپنی جگہ نہ دیر، نہ کعبہ، نہ میکدہ
ملتے ہیں لامکاں سے مکانی کے سلسلے

فرہاد و قیس وامق و رانجھا شفیق سب
میرے فسانے میری کہانی کے سلسلے

*

آئینے ٹوٹیں گے جب چہرے فنا ہو جائیں گے
ہم حدودِ جاں سے گزرے تو رہا ہو جائیں گے

قربتوں میں آئے گا ایسا مقام رنگ و بُو
حرف جتنے ہیں وہ سارے بے صدا ہو جائیں گے

جگنوؤں کا شہر ہو گا جب ترا عکسِ بدن
روشنی کے سارے منظر آئینہ ہو جائیں گے

برگِ گُل سے تیری خُوشبو لے کے آئے گی صبا
تتلیوں کے پَر ترا بندِ قبا ہو جائیں گے

رہگُزارِ عشق میں ایسا بھی لمحہ آئے گا
جھلملاتے لفظ پلکوں سے ادا ہو جائیں گے

وہ شفیق آصف، وفا پر جن کی ہم کو ناز تھا
کیا خبر تھی رفتہ رفتہ بے وفا ہو جائیں گے

---

*

اِک فکرِ درخشاں سے جہاں جاگ رہا ہے
آصفؔ مِرا احساسِ جواں جاگ رہا ہے

جو سو گئے وہ سو گئے آغوشِ لحد میں
نازاں ہُوں مِرا نام و نشاں جاگ رہا ہے

بے چارے غریبوں کی کمائی ہی یہی ہے
جو کچّے گھروندوں میں دھواں جاگ رہا ہے

ہر سُو ہے اندھیروں کا تسلّط سرِ ہستی
اور اس پہ مرا عزمِ جواں جاگ رہا ہے

Scanned with CamScanner

اس گھور اندھیرے میں ہے کس شخص کی آمد
یہ کس کے لیئے شعلۂ جاں جاگ رہا ہے

جذبے ہیں مرے آج بھی اس بات کے شاہد
آنکھوں میں کوئی خوابِ گماں جاگ رہا ہے

آصفؔ مرے افکار علامت ہیں سحر کی
شعروں میں مرے عصرِ رواں جاگ رہا ہے

Scanned with CamScanner

ہے میرے دل کے آئینے میں اِک تصویر مٹی کی
مِرے مٹی کے خوابوں کو مِلی تعبیر مٹی کی

اُبھرنا اور رنگوں میں اُتر آنا دھنک بن کر
یہ اندازِ محبت ہے نئی تفسیر مٹی کی

شفیق آصف